میر تقی میرؔ کی منقسم شخصیت

سید علی عباس جلالپوری

میر تقی میرؔ کے کلام کے بارے میں بجا طور پر کہا گیا ہے کہ بلندش غایت بلند و پستش غایت پست۔ ایک طرف اُن کے بہتر نشتر ہیں جو اعلیٰ درجے کی عشقیہ شاعری کے عمدہ نمونے ہیں جن میں از خود رفتگی اور خلوصِ جذبہ کا ثبوت ملتا ہے۔ دوسری طرف اُن کے کلام کا غالب حصّہ، جو سوقی رکاکت اور ہزل و تمسخر سے مملو ہے۔ میر تقی کے پرستاروں نے مدح سرائی کے جوش میں اس دوسرے حصے کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں بلند و پست کے اس گہرے تضاد میں منقسم شخصیت[1] کارفرما ہے۔ یعنی میر تقی میرؔ کے وجود میں دو واضح شخصیتیں جمع ہو گئی تھیں۔ ایک اعلیٰ، دوسری سفلی۔ اُن کا بلند پایہ کلام اعلیٰ شخصیت کی دین ہے اور عامیانہ و مبتذل سفلی کی تخلیق ہے۔ فارسی کے شعرا نے بھی ریاکار ملاؤں کی دین فروشی پر پھبتی کستے ہوئے یا عشاق کی مواصلت کی وصف نگاری کرتے ہوئے کہیں کہیں فحش و ہزل سے کام لیا ہے لیکن اُن کے کلام میں اس نوع کے اشعار اقل قلیل ہیں اور محض ایک روایت کی ترجمانی کرتے ہیں جبکہ میر تقی میرؔ کے دواوین میں سوقیانہ اور رکیک مضامین اس کثرت و تواتر سے ملتے ہیں کہ انہیں محض روایت کا حصہ نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ ان کے پیچھے ایک واضح ذہن و کردار کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ بات کو آگے بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ منقسم شخصیت کی توضیح کر دی جائے۔

علمائے نفسیات کے خیال میں منقسم شخصیت اُس وقت ظہور پذیر ہوتی ہے جب کسی آدمی کی ذہنی واردات میں ربط و تعلق قائم نہیں رہتا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کا ذہن ہر وقت حرکت یا سیلان کی حالت میں رہتا ہے حتیٰ کہ سوتے میں بھی اُس کا یہ عمل معطل نہیں ہوتا بلکہ خوابوں کی صورت میں جاری رہتا ہے۔ شعور کی رَو متواتر و مسلسل ہوتی ہے۔ اس کی عام فہم مثال یہ ہے کہ ایک لمحے میں ہم آج صبح کے کسی واقعے کے بارے میں سوچ رہے ہوتے ہیں اور دوسرے ہی لمحے میں آج سے بیس برس پہلے کی کوئی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس کے مابعد دفتر جانے کا خیال آ جاتا ہے۔ نارمل ذہن کی ایک سوچ اور دوسری سوچ یا ایک یاد اور دوسری یاد کے درمیان کوئی وقفہ نہیں ہوتا خواہ یہ سوچیں یا یادیں ایک دوسری سے کتنی ہی مختلف و متضاد ہوں ان میں ربط و تسلسل بہر صورت قائم رہتا ہے اور ذہن کی سیلانی حرکت باقی رہتی ہے۔ جب شعور کی رَو جمود کسی ایک نقطے پر آ کر رک جائے یا ایک خیال دوسرے خیال سے کلی طور پر منقطع ہو جائے تو آدمی خبطِ ذہن[2] کا شکار ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک پاگل کا شعور ٹکڑوں میں بٹ کر [illegible] بن جاتا ہے۔ ایک لمحے میں وہ اپنے آپ کو شہنشاہ سمجھتا ہے اور شاہانہ انداز میں مطالبہ کرتا ہے کہ لوگ جھک کر اسے سلام کریں اور دوسرے ہی لمحے میں کسی سے عاجزانہ لہجے میں ایک سگریٹ کی فرمائش کرتا ہے۔ یہ خیالات[3] کی بے ربطی ہے جس نے اس کا ذہنی توازن درہم برہم کر دیا ہے۔

خیالات کی یہی بے ربطی بعض حالات میں منقسم شخصیت کا سبب بن جاتی ہے جس کے دونوں پہلوؤں کے اپنے اپنے مستقل جذبات ہوتے ہیں، اپنی اپنی پسند و ناپسند ہوتی ہے۔ اپنی اپنی اخلاقی قدریں ہوتی ہیں۔ اس قسم کا آدمی بظاہر نارمل زندگی گزارتا ہے اور اس کے معمولات میں کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اسے قریب سے دیکھنے والے جان جاتے ہیں کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ابتدائی صورت میں منقسم شخصیت کی ایک مثال رنگِ مزاج[4] کا بدلتے رہنا ہے ہم کبھی خوشی محسوس کرتے ہیں اور کبھی بیٹھے بٹھائے افسردہ خاطر ہو جاتے ہیں۔ خوشی اور افسردگی کے اسباب ہمارے لاشعور میں ہوتے ہیں۔ ہمارا رنگِ مزاج جامد ہو جائے تو

[1] SPLIT PERSONALITY [2] INSANITY [3] DISSOCIATION OF IDEAS [4] MOOD

فتورِ ذہن کا باعث ہو سکتا ہے لیکن ہماری خوش قسمتی سے ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے اور ذہن کی سیلانی حرکت ہمیں خللِ ذہنی سے محفوظ رکھتی ہے۔

شعوری رَو کی عارضی یا مستقل بے ربطی ذہنی کشمکش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ہمارا ذہن ناگوار تجربات اور تلخ احساسات سے نجات پانے کے لئے انھیں دبا دیتا ہے اور وہ ہمارے لاشعور میں چلے جاتے ہیں لیکن مٹتے نہیں بلکہ الجھنوں کی صورت میں ہمارے شعور کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ منقسم شخصیت کی ایک مثال ولیم جیمز نے اس روسی شہزادی کی دی ہے جو تھیٹر میں بیٹھی کسی المیہ کے فرضی کرداروں کے مصائب پر آنسو بہا رہی ہو جب کہ اس کا کوچوان تھیٹر کے باہر برف باری کی شدت سے اکڑا جا رہا ہو اور شہزادی کو اس کی تکلیف کا مطلق احساس نہ ہو۔ منقسم شخصیت کی ایک اور عام مثال ایک ریاکار شخص کی ہے جس کی دو شخصیتیں ہوتی ہیں ایک حقیقی دوسری دکھاوے کی اور یہ دونوں اپنا اپنا مستقل مقام رکھتی ہیں۔ حقیقی شخصیت بد مزاج، بے دین، خود غرض، فرومایہ اور متکبر ہوتی ہے اور دکھاوے کی شخصیت نیاز مند، متدین، خلیق اور ایثار پیشہ ہوتی ہے۔ اس قسم کے لوگ سیاسیات میں بڑے کامیاب ہوتے ہیں۔ میکیاولی نے اپنی کتاب میں شہزادے کو تلقین کی ہے کہ خواہ وہ باطن میں وہ کتنا ہی بے دین ہو اسے عوام کو بہر صورت اس بات کا یقین دلانا چاہیے کہ وہ دین کا بہت بڑا پاسبان ہے۔

منقسم شخصیت کی ایک عجیب و غریب صورت یہ ہے کہ بعض لوگ اچانک اپنا نام اور ماضی بھول جاتے ہیں۔ دبائی ہوئی خواہشات لاشعور کی تہ سے اچانک ابھر آتی ہیں اور ان کے گرد ایک نئی شخصیت کا تار و پود بُنا جاتا ہے جو نارمل شخصیت سے مختلف ہوتا ہے۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ آدمی اپنے موجودہ حالات سے نفرت کرنے لگتا ہے اور اس سے فرار حاصل کرنے کے لئے ایک بالکل نئی شخصیت اختیار کر لیتا ہے۔ منقسم شخصیتیں بدلتی بھی رہتی ہیں۔ کبھی نارمل شخصیت غالب آجاتی ہے اور کبھی ثانوی شخصیت کا تصرف ہو جاتا ہے۔ فرانس کے ڈاکٹر جینے نے منقسم شخصیت پر بحث کرتے ہوئے ایک دیہاتی لڑکی کا واقعہ بیان کیا ہے جس کی شخصیتیں بدلتی رہتی تھیں۔ یہ لڑکی اپنی صورت حال کا وقوف رکھتی تھی جب وہ محسوس کرتی کہ اس کی ثانوی شخصیت غلبہ پا رہی ہے تو وہ یادداشت کے طور پر کاغذ پر لکھ لیتی کہ اس وقت وہ کیا کام کر رہی تھی۔ اس کے بعد وہ سب کچھ بھول جاتی جب دوبارہ اس کی نارمل شخصیت پلٹ کر آتی تو وہ اپنے کاغذ کی تحریر کو دیکھ کر دوبارہ اپنے معمولات میں جُت جاتی۔ اس کی دونوں شخصیتوں کا اپنا الگ مزاج تھا، الگ یادیں تھیں، الگ احساسات تھے۔ اس کی نارمل شخصیت بدمزاج، لاابالی اور ضدی تھی جب کہ ثانوی شخصیت ذہین اور متحمل تھی۔ شروع شروع میں اس کی نسیان کاری کے وقفے کم مدت کے ہوتے تھے لیکن بعد میں خاصے طویل ہو گئے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس کی ثانوی شخصیت مستقل بالذات صورت اختیار کر گئی اور نارمل شخصیت دب کر رہ گئی۔

ڈاکٹر مارٹن پرنس کی ایک ہسٹریائی مریضہ مس بوشمپ کی ایک نہ دو چار مختلف شخصیتیں تھیں جو اپنی اپنی جگہ خود مختار تھیں۔ اس کی اصل شخصیت محنتی، شرمیلی اور فرض شناس تھی اور مذہبی ذہنیت کی تھی اور دوسری چڑچڑی، خود نما اور بے دین تھی۔ دونوں کو ایک دوسری کا کوئی شعور نہ تھا۔ نہ ایک دوسری کی واردات اور یادوں کا کوئی علم تھا۔ دونوں بسا اوقات ایک دوسری میں بدلتی رہتی تھیں اور باہم متخالف تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک ہی وجود میں دو ہستیوں نے بسیرا کر لیا ہے۔

ڈاکٹر مارٹن پرنس کی تحقیق سے اس امر کا انکشاف ہوا کہ مس بوشمپ دوبارہ عشقِ ناکام کے آشوب سے گذری تھی اور اپنی پر جوش آرزوؤں اور سلگتے ہوئے ارمانوں کو دبانے سے اس کی شخصیت منقسم ہو گئی تھی۔ ان دونوں میں تیسری کا اضافہ ہو گیا جس کا نام اس نے سیلی رکھا۔ سیلی اس وقت نمودار ہوئی جب ڈاکٹر مارٹن پرنس نے مس بوشمپ پر تنویمی نیند طاری کی۔ اس حالت میں وہ بچوں جیسی خفیف حرکتیں کیا کرتی تھی۔ مارٹن پرنس کے علاج سے دونوں متخالف شخصیتوں میں مفاہمت ہو گئی تو چوتھی شخصیت پیدا ہوئی جو رفتہ رفتہ منفرد صورت اختیار کر گئی۔

ڈاکٹر ولیم رگ نے اپنے مجلّے LANCET میں ایک ۳۰ سالہ خاتون کے حالات چھپوائے تھے جس کی سات مختلف شخصیتیں تھیں۔ ڈاکٹر رگ نے بہ نفسِ علاج سے ان میں مفاہمت تو ایک حد تک پیدا کر دی لیکن وہ عوامل جو ان کی تہ میں کارفرما تھے پوری طرح رفع نہ کئے جا سکے۔ اس عورت کی ایک نمایاں شخصیت صلح جو اور امن پسند تھی جب کہ دوسری باغی اور ہٹیلی تھی اور ہر قیمت پر اپنی خواہشات کی آسودگی پر کمربستہ رہتی تھی۔

---

۱ PSYCHOLOGY OF INSANITY, BERNARD HART

۲ ILLUSIONS AND DELUSIONS, ROWCLIFFE

۳ اصطلاح میں اسے FUGUE کہتے ہیں۔

اپنی انتہائی صورت میں منقسم شخصیت، کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اس نوع کی شخصیتیں اب تک صرف پچاس ہی دریافت کی گئی ہیں۔ البتہ ابتدائی اور معتدل صورت میں منقسم شخصیتیں عام طور سے ملتی ہیں۔ دنیائے ادب میں آر۔ ایل۔ سٹیونسن نے اپنی کہانی "مسٹر جیکل اور مسٹر ہائڈ" میں غالباً پہلی مرتبہ منقسم شخصیت کو کہانی کا موضوع بنایا تھا۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ڈاکٹر جیکل ایک سائنس داں ہے جس کے خیال کے مطابق انسانی فطرت کا خمیر شر اور خیر کے متضاد عناصر سے اٹھا ہے۔ جیکل شر کو خیر سے جدا کرنے کے لئے ایک محلول تیار کرتا ہے اور اسے پی کر ایک ملحد شخصیت مسٹر ہائڈ کا روپ دھار لیتا ہے جو مجسم شر ہے۔ اسی روپ میں وہ ایک آدمی کو قتل کر دیتا ہے۔ اس کا اپنا انجام بھی المناک ہوتا ہے۔ اس کہانی میں سٹیونسن نے گہری نفسیاتی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔

مندرجہ تصریحات کی روشنی میں میر تقی میر کی شخصیت کا مطالعہ مفید مطلب ثابت ہوگا۔ میر تقی میر کے والد ایک باکمال خدا رسیدہ صوفی تھے ان کی کرامات کا ہر کہیں چرچا تھا۔ ان کی روحانی توجہ سے متاثر ہو کر ان کے ایک ارادت مند امان اللہ نے اپنا گھر بار چھوڑ دیا تھا اور انہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ میر تقی میر نے اپنے پاک منش والد اور امان اللہ جیسے زاہد مرتاض کی صحبت میں آنکھ کھولی تھی اور ہر نوخیز کی طرح ان کی شخصیت اور کردار سے متاثر ہوئے تھے۔ ظاہر ان کا پدری نصب العین اعلیٰ و ارفع تھا۔ قدرت نے انہیں پر جوش طبیعت ارزانی کی تھی جس کا علم ان کے باپ کو بھی تھا۔ میر تقی میر کے الفاظ میں ان کے والد

ہر گاہ مرا در بغل کشیدے و بنظر شفقت رنگ کاہی مرا دیدے گفتے کہ اے سرمایۂ جان! ایں چہ آتشے است کہ در دل نہان است و چہ سوزیست کہ ترا با جان است:

ان کے والد ماجد کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ اس آتش بجان کی مناسب تربیت نہ ہوئی تو وہ کج روی کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ لیکن بد قسمتی سے ان کی بے وقت وفات نے میر تقی میر کو ان کے فیضانِ صحبت سے محروم کر دیا۔ میر کا ایک شعر ہے ؎

ہے تیرہ روز اپنا لڑکوں کی دوستی سے — اس دن ہی کو کہے تھا اکثر پدر ہمارا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر تقی میر کے والد نے ان کے ہم جنسی رجحان کو بھانپ لیا تھا اور اس کے بارے میں متنبہ بھی کیا تھا۔ بہر حال والد کی وفات کے بعد میر تقی میر کسمپرسی کے عالم میں ترک وطن پر مجبور ہو گئے اور دلی کا رخ کیا۔ جب ان کے سرپرست امیر الامرا صمصام الدولہ مارے گئے تو میر آگرہ لوٹ آئے۔ انہیں ایام میں وہ ایک پری تمثال کے عشق بلاخیز میں مبتلا ہوئے۔ طبیعت میں آشفتگی تو تھی ہی، خود بھی رسوائے دہر ہوئے اور اس عفیفہ کو بھی عبث بدنام کیا۔ عزیزوں کی لعن طعن سے آزردہ ہو کر "بادے بغل پروردہ حسرت و حرمان دبا خاطر ناشاد و دست تہی پا" گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور "تا بقید حیات بود طوق محبت در گردن و سلسلۂ دیوانگی بپا داشت" دلی جا کر اپنے سوتیلے بھائی محمد حسن کے خالو سراج الدین علی خاں آرزو کے یہاں قیام کیا۔ کچھ مدت کے بعد محمد حسن نے اپنے خالو کو لکھا "میر محمد تقی فتنۂ روزگار است زنہار بہ تربیت او نہ باید پرداخت"۔

اس شکایت کے باوجود شریف النفس خان آرزو نے میر تقی میر کی تعلیم و تربیت میں سعی بلیغ کی اور انہیں فارسی اور عربی کی کچھ کتابیں پڑھائیں لیکن میر تقی اس یگانۂ روزگار سے پوری طرح استفادہ نہ کر سکے اور دلی کے اوباشوں اور رذیلوں کی صحبت بد میں گھومنے پھرنے لگے۔ خان آرزو نے آوارگی اور بدکاری سے منع کیا تو احسان ناشناسی پر خود داری کا پردہ ڈال کر ان کے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ان ایام میں ان کی شاعری کی شہرت ہو چلی تھی۔ تلاش معاش میں ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے لکھنؤ پہنچے جہاں نواب وزیر آصف الدولہ نے معقول مشاہرہ مقرر کیا اور فراغت سے گزر بسر کرنے لگے۔

دلی کے دوران قیام میں میر تقی میر کے ذہن میں فتور آ گیا تھا اور وہ چاند میں خوفناک صورت دیکھنے لگے تھے۔ کہتے ہیں:

جگر جور گردوں سے خوں ہو گیا — مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا

ہوا خبط سے مجھ کو ربط تمام — لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام

یہ وہم غلط کار یاں تک کھنچا — کہ کار جنوں آسماں تک کھنچا

نظر رات کو چاند پر گر پڑے — تو گویا کہ بجلی سی دل پر پڑے

ILLUSIONS AND DELUSIONS. RAWCLIFFE.

نظر آئی اک شکل مہتاب میں
کمی آئے جس سے خور و خواب میں

کہتے ہیں کہ علاج معالجے اور جھاڑ پھونک سے شفا ہو گئی تھی لیکن اس کے اثرات رفع نہ ہو سکے۔ پژمردگی کے دورے اکثر پڑتے رہے جس کے باعث انھیں گوشہ گیر ہونا پڑا۔ ایک رباعی میں کہتے ہیں ؎

چپکا چپکا پھرا نہ کر تو غم سے
کیا حرف و سخن عیب ہے کچھ محرم سے
آخر کو رکے رہتے جنوں ہوتا ہے
اے میر کوئی بات کیا کر ہم سے

عبدالباری آسی مقدمۂ کلیاتِ میر میں لکھتے ہیں۔

"ان کو اپنے اوائل شباب میں جنوں ہو چکا تھا اور گو وہ علاج ہونے پر اس سے صحت یاب ہو گئے تھے مگر پھر بھی کسی قدر اس کا اثر باقی تھا جس نے انھیں بد دماغ مشہور کر دیا تھا۔"

راقم الحروف کے خیال میں یہ فتورِ ذہن میر تقی میر کی منقسم شخصیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ عبدالباری آسی نے جس کیفیت کو صحت سے تعبیر کیا ہے اس کا مفہوم نفسیات کی زبان میں یہ ہوگا کہ میر تقی میر کے ذہن کی سیلانی حرکت میں جو بے ربطی واقع ہو گئی تھی وہ نرم پڑ گئی اور ان کی منقسم شخصیت کے دونوں پہلو متبادل صورت اختیار کر گئے جس کے باعث وہ بظاہر ایک نارمل آدمی کی زندگی گزارنے لگے۔ دوسرے الفاظ میں ان کی اعلیٰ اور اسفل شخصیتوں میں کبھی اعلیٰ غالب آ جاتی اور کبھی اسفل قابو پا لیتی تھی۔ ان کی اعلیٰ شخصیت بچپن کے صالح ماحول میں تشکیل پذیر ہوئی تھی اور اسفل دلی کے اوباشوں اور لفنگوں کی صحبت میں پروان چڑھی تھی۔ ان کے اوائل شباب کے عشقِ صادق کو بلند شخصیت سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ ان کی اعلیٰ شاعری اسی عشق کی عطا ہے۔ ان کا یہ کلام معلوم عوام ہے۔ ہم نمونے کے بطور چند اشعار درج کریں گے ؎

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دل پرخوں کی اک گلابی سے

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

دیدنی تھی شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا
گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری

دوسری طرف ان کا سوقیانہ کلام ہے جو ان کی شخصیت کے اسفل پہلو کی تخلیق ہے۔ رکیک مضامین سے ان کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ ان کا زمانہ مغلیہ تمدن کا دورِ تنزل تھا جب سلاطین و امرا ناسازگار حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی بجائے مجالس ناؤ نوش اور امردوں اور رنڈیوں کے آغوش میں پناہ لے رہے تھے۔ عوام بھی حکمرانوں کی دیکھا دیکھی انھیں مکروہات میں غرق ہو کر رہ گئے۔ میر تقی میر نے ہوا و ہوس کے کوچے کی جی بھر کر سیر کی اور طفلانِ تہ بازار کے پیچھے مارے مارے پھرتے رہے۔ وہ اپنے آپ کو وحشی کہتے ہیں اور اپنی سدومیت کا برملا اعتراف کرتے ہیں ؎

جب نہ تب ملتا ہے بازاروں میں میر
ایک وحشی ہے وہ خام سرفروش

پھرے ہے باؤلا سا پیچھے ان شہری غزالوں کے
بیاباں مرگ ہوگا اس چلن سے میر بھی آخر

میر تو طفلانِ تہ بازار میں
دیکھو شاید ہو وہیں وہ دلفروش

طفلِ تہ بازار کا عاشق ہوں میں
دلفروشی کوئی مجھ سے سیکھ لے

کم سنی میں شاہد بازیاں کاہے کو زیب تھیں
دیا لڑکوں کو دل میں نے قیامت میں بھی ناداں ہوں

معقول اگر سمجھتے تو میر بھی نہ کرتے ۔ لڑکوں سے عشق بازی ہنگام کہنہ سالی

آنکھوں سب پوست سے پینے لگے ہیں لڑکے ۔ عشق میں ان نوخطوں کے تیر ہیں سطر ہوا

کیا اُس آتش باز لونڈے کا ہے اتنا شوق میر ۔ بہ چلی ہے دیکھ کر اس کو تمہاری رال کچھ

دل لے کے لونڈے دلی کے کب کا پچا گئے ۔ اب اُن سے کھائی پی ہوئی شے کیا وصول ہو

ان پریوں سے لڑکوں کے جھپیٹے میں دل گئے ۔ حیرت زدہ عشق ہیں دیوار ہیں ہم لوگ

تنگ پوشی تنگ درزی اس کی جی میں کھب گئی ۔ کیا ہی وہ محبوب خوش ترکیب خوش پوشاک تھا

تک بچے سے عشق کیا تھا بچے کیا کیا میں نے کیے ۔ رفتہ رفتہ ہندستان سے شعر مرا ایران گیا

لڑکے شوخ بہت ہیں لیکن ویسا میر نہیں کوئی ۔ دھوم قیامت کی سی ہے ہنگامہ اس کے اودھم کا

امیرزادوں سے دلی کے مل نہ تا مقدور ۔ کہ ہم فقیر ہوئے ہیں انھیں کی دولت سے

کیا میر تو روتا ہے پامالی دل ہی کو ۔ ان لونڈوں نے تو دلی سب سر پہ اٹھائی ہے

کہا یہ وضع لوگوں نے جو دیکھا رات کو ملتے ۔ ہوا صحبت میں ان لڑکوں کے ضائع روزگار اپنا

کیا بلا ہے لاگ بھی دل کی کہ میر جی ۔ دامن سوار لڑکوں کے ہو کر نفر رہے

ان نوخطوں سے میری قسمت میں تو تھی کالی ۔ کس طرح کی میرا کوئی آگے منا جاوے

مت چھوڑنا ہمارا اس لڑکے پر نہ دیکھو ۔ ٹک دیکھو اس شکست طرف کلاہ کو بھی

میر تقی میر نے اپنے دواوین میں ایک ایک کر کے دلی کے تمام آوارہ خش لونڈے گنائے ہیں۔ معاملہ بندی میں رکاکت اور ابتذال کا رنگ زیادہ گہرا ہو گیا ہے ؎

یار ہیں اُس کے ساق سیمیں کے ۔ دے دے مارا ہوں ہاتھ رانوں پر

ان زمانے میں جن کی خرچی روپے ۔ پچا سا کرتے ہیں اُن کو آنوں پر

میں نے جوری کی تو روتا سر چڑھا وہ بدمعاش ۔ لات ہی کو دوڑتا ہے اب مجھے حملا بھی

میر کی عیاری معلوم لڑکوں کو نہیں ۔ کرتے ہیں کیا کیا ادا ہیں اس کو سادا سمجھ

راتوں پاس گلے لگ سوتے ننگے ہو کر ہے یہ عجب ۔ دن کو بے پردہ نہیں ملتے ہم سے شرماتے ہیں ہنوز

ساتھ کے پڑھنے والے فارغ تحصیل علم سے ہو بھی چکے ۔ جہل سے مکتب کے لڑکوں میں ہم دل بہلاتے ہیں ہنوز

اوباش بھی ہمارا کتنا ہے ٹیڑھا بانکا ۔ دیکھو اس کو ہو گئے ہیں کیا کیا کشیدہ مردم

جب بھی کچھ اپنے گنے رکھتے تھے تب بھی صرف تھا لڑکوں کا ۔ اب جو فقیر ہوئے پھرتے ہیں میر انھیں کی دولت ہے

لڑکا عطار کا ہے کیا مجنوں ۔ ہم کو ترکیب اُس کی بھاتی ہے

اڑا گڈی وہ باہر نہ آوے ۔ مبادا مجھ کو بھی گڈا بنا دے

عاشق ہو تو رسا پچگاں پر تا کیفیت حاصل ہو ۔ اور کبوتر کا جو چاہو میر مغاں کو پیر کرو

ہندو بچوں سے کیا معیشت ہو ۔ یہ کبھو لگ دان لیتے ہیں

حرف شناس نہ تھے جب تم تو بے پرسش تھا ہر اک لب ۔ ایک اک بات کی شتاقوں سے سو سو اب تکراریں ہیں

صحبت میں اس کی یونہ رہے مرد آدمی — وہ صبح و شام وہ بے تہ اوباش و بدمعاش

کیا شیریں ہے حرف و حکایت حسرت ہم کو آتی ہے — ہائے زباں بھی اپنی ہوتے یکدم اُس کے دہن کے بیچ

شب اُس کو میں نے دیکھا سوتے بغل میں اپنے — اس خواب کی نہ کرنی تعبیر ہے مناسب

مخلوط ترسا بچوں سے شیرہ خانے میں رہا — کن نے دیکھا مسجدوں میں میرؔ کافر کیش کو

غریبوں کی تو پگڑی جا پہ ہے تک اے ہے اترواتو — مجھے اے سیم بر پہلے بری میں جو زردار عاشق ہو

اگرچہ جلتے ہیں جھنگ غیرت سے یہ لڑکے — دل جگر دونوں کو یکلخت جلا دیتے ہیں

ناسازی طبیعت کیا ہے جواں ہوئے پر — اوباش وہ ستم گر لڑکا ہی ہے لڑاکا

گو خط اس کے پشت لب کا زہر ہو — بوسہ کنج دہن تریاق ہے

سماجت جو کی بوس لب پر تو بولا — نہیں خوب یہ مار کھانے کی باتیں

کھول کر بال سادہ رو لڑکے — خلق کو کیوں وبال لیتے ہیں

وہ سیم تن ہو ننگا تو لطف تن پر اُس کے — سو جی گئے ہیں صدقے اک جان وار کیا ہے

لڑکے دلی کے تیرے ہاتھوں میں کب آتے ہیں میرؔ — پیچھے ایک ایک کے سو سو پھرے ہیں ڈاگ گے

بھیڑیں ٹلیں اُس ابروئے خمدار کے پیچھے — لاکھوں میں اس اوباش نے تلوار چلائی

اک خلق تماشی ہے تم ہاتھ نہیں لگتے — لڑکے تو ہو پر سب کو بالا ہی بتاتے ہو

ستم ہیں قہر ہیں لونڈے شراب خانے کے — اتار لیتے ہیں عمامہ ہر نمازی کا

کس طرح ان سے کوئی گرم ملے — سیم تن پگھلے جاتے ہیں جوں رانگ

سمجھے نہ کر بازیچہ اطفال ہوئے — لڑکوں سے ملاقات ہی نادانی ہے

باہم ہوا کریں ہیں دن رات نیچے اوپر — یہ نرم شانے لونڈے ہیں مخمل دو خوابا

کیا لڑکے دلی کے ہیں عیار اور نٹ کھٹ — دل لیتے ہیں یوں کہ ہرگز ہوتی نہیں ہے آہٹ

دلی کے کج کلاہ لڑکوں نے — کام عشاق کا تمام کیا

کوئی عاشق نظر نہیں آتا — ٹوپی والوں نے قتل عام کیا

جنس بازار میں ہے مجھ سی متاع — ڈھیر سی رہتی ہے دوکانوں پر

کبھی اوباش کی ہے وہ دربند — ڈالے پھرتے ہیں بند شانوں پر

پیسوں پر دیکھتے ہیں یہ لڑکے — عشق سیکھیں تناں کو زر ہے شرط

میر تقی میرؔ کا ہزل، تمسخر اور فحش بھی اُن کی شخصیت کے اسفل پہلو کی نشان دہی کرتا ہے ۔

لذت دنیا سے کیا بہرہ ہمیں — پاس ہے رنڈی رہے ہے ضعف باہ

شیطنت سے نہیں ہے خالی شیخ — اُس کی پیدائش احتلام سے ہے

کچھ بھی نسبت دی تھی جب دیکھت تب کیا تھا شیخ — ہم حرم میں بھی رہے تو تیرے داماد رہے

صحبت سے اس جہاں کی کوئی خلاص ہوگا — اس فاحشہ پہ سب کو اک میل ہو گیا ہے

گدھا سا لدا پھرتا ہے شیخ ہر سو — کہ جبہ ہے اک بار و عمامہ سر بار

کچھ کم نہیں ہیں شعبدہ بازوں سے میگسار — دارو پلا کے شیخ کو آدم سے خر کیا

کامہ ہے موزوں مسجد کو یار غر — قد تو اخمیدہ جو محراب سا ہوا

شیخ کی سی شکل ہے شیطان — جس پہ شب احتلام ہوتا ہے

داڑھی سفید شیخ تو مت نظر میں کر — بگلا شکار ہو جب تھمتے ہیں ہاتھ پہ

کیا تم کو پیار سے وہ اے میر منہ لگاتے — پہلے ہی چومے تم تو کاٹو ہو گال اس کا

بہکے جو ہم مست آ گئے سو بار مسجد سے اٹھا — واعظ کو مارے خوف کے کل لگ گیا جلاب سا

شور قلقل کی ہوتی تھی بانگ — ریش قاضی پہ رات میں تھوکا

شیخ مت روکش ہو مستوں کا تو اس جھجڑ پڑ — لینے اٹھتے کر دھیا تیری کھل جاتی ہے تانت

حد سے زیادہ واعظ یہ کودنا اچھلنا — کاہے کو جاتے ہیں ہم اسے خوش اب بندھا رہ

تو شملا جو رکھتا ہے خر ہے وگرنہ — ضرورت ہے کیا شیخ دم اک وجب کی

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا میخانہ میں — جبہ خرقہ کرتی ٹوپی مستی میں انعام کیا

یہ جانتا تو اس سے ہم خواب میں نہ ہوتا — بچا خیال ہی کا ایسا خیال اس کا

میر تقی میر کی منقسم شخصیت اُن کی بد دماغی اور ذلت پسندی کے تضاد میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ میر کو تنک مزاج، متکبر اور بد دماغ کہا گیا ہے۔ وہ خود بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں ؎

صحبت کسو سے رکھنے کا اس کو نہ تھا دماغ — تھا میر بے دماغ کو بھی کیا بلا دماغ

تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی — تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

دوسری طرف شاعری میں وہ اپنے آپ کو ذلت پسند اور حد تک حقیر و ذلیل کر دکھاتے ہیں۔ کبھی وہ اپنے محبوب کے تلوے آنکھوں سے سہلاتے ہیں، کبھی اس کے آستانے پر سر رگڑتے ہیں، کبھی اس کے کتے کی صحبت پر فخر کرتے ہیں، کبھی ذلت کے مزے لوٹتے ہیں ؎

مزے کو عشق کی ذلت کو جانتا ہے وہی — کسو کی جس نے کبھی لات کی کھائی ہو

سر رگڑتے اس آستاں پر میر — یاوری کرتے اگر جانے نصیب

مت سگ یار سے دعوائے مساوات کرو — اس کتے کے پیچھے پاؤ تو مساوات کرو

جب دیکھتے ہیں پاؤں ہی ادھر جو اس کے میر — کیوں ہوتے ہو ذلیل تم اتنا تو مت زدو

گود میں رکھ دیتا ہے میری پاؤں حنائی دینے کو — یوں پامال جو میں ہوتا ہوں بجلی بھی تو دب کی ہے

یہ نہیں ہیں جانتا نسبت ہے کیا آپس میں لیک — آنکھیں ہو جاتی ہیں ٹھنڈی اس کے تلووں سے ملے

پاؤں سر پہ رکھنے کی مجھ کو رخصت دی تھی میرزا نے — کیا پوچھو ہو سر پر میرے منت کی منت ہے اب

وہ دن کیسے تھے جو آ کر سوتے پاتے تھے — آنکھوں سے ہم سہلا سہلا تلوے اس کے جگاتے تھے

بعض ناقدین نے میر تقی میر کے کلام پر المیہ کا اطلاق کیا ہے جو المیہ کے مفہوم سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ المیہ میں ضبط و RESTRAINT سے تاثیر پیدا ہوتی ہے جیسا کہ یونان قدیم کے تمثیل نگاروں اور احیاء علوم کے عہد کے فرانسیسی اور انگریز المیہ نگاروں کی تمثیلوں سے ظاہر ہونے والے

نالہ و بکا، بین کرنا، چھاتی کوٹنا، سر پیٹنا، پچھاڑیں کھانا المیے کے منافی ہے کیونکہ رقیق جذباتیت مضحکہ خیز (BATHETIC) صورت اختیار کر لیتی ہے جس سے المیہ کا وقار مجروح ہو جاتا ہے۔ اس کی عام فہم مثال یہ ہے کہ ایک شخص اپنے کسی عزیز کی موت پر چیخ چیخ کر رونے اور دیوار سے سر پھوڑنے لگے تو دیکھنے والے چنداں متاثر نہیں ہوتے لیکن وہ با وقار انداز میں چپ چاپ غم و الم کی تصویر بنا بیٹھا ہو تو عزاداروں کی آنکھیں بے اختیار بھیگ جاتی ہیں۔ میر تقی میر اظہار غم میں بسا اوقات رقیق جذباتیت سے کام لیتے ہیں اور اس قدر غلو کرتے ہیں کہ طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ اس نوع کے کلام کو ان کی عامیانہ شخصیت سے منسوب کیا جا سکتا ہے ــ

دل جلا اک آبلہ پھوٹا گیا ، رات کو سینہ بہت کوٹا گیا

گر زیں کیا سنہ کر گئے کوٹ لی چھاتی ــ دل تنگی ہجراں سے اس مغلوب غضب ہم

چھاتی کوئی منہ نوچا سر دے مارا پتھر پر ــ دل کے خون ہونے میں ہمارے یہی طریق ہے ماتم کا

کیا برچھیاں چلائیں آہوں نے نیم شب کی ــ رخنے ہیں آسماں میں سارے نہیں ستارے

آستینیں رکھتے رکھتے دیدۂ خونبار پر ــ حلق بسمل کی طرح دو ہو کے فوارے ہوئے

جوش مارا اشک خونیں نے مرے دل سے زبس ــ گھر میں ہمسایوں کے شب دو ہو کے پرنالے پڑے

انھیں گلیوں میں جب تھے ہم تو تھی ــ گنگ دریا کی دھاریں ہو گئی ہیں

دامن کوہ میں جو میں دھاڑ مار رویا ــ اک ابر وہاں سے اٹھ کے بے اختیار رویا

بجھ جو آنکھوں سے چھلکتے ہیں آنسو ــ تو بھر جاتا ہے پانی سب زمیں پر

گڑتے ہیں پھوڑاں سر پر خار اب تک ــ جس دشت میں پھوٹا ہے مرے پاؤں کا چھالا

میر تقی میر بار بار اپنے دل کو پکا ہوا پھوڑا کہتے ہیں جس سے گھن آنے لگتی ہے۔

پھوڑا سا ساری رات جو پکتا رہے گا دل ــ تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جائے گا

تھا دل جو پکا پھوڑا بسیار ورم ہے ــ دکھتا گیا وہ چنداں جوں جوں دوا لگائی

ایسا ہو کہ چھیڑے یک بار پھوٹ بہیے ــ ہم کہ پھوٹنے کی اب مانند بھرے ہیں

ان چاروں سے بھوں میں افسردہ دکھے دگر نہ ــ پھوڑا سا دل بغل میں برسوں چلا گیا ہے

دل نے کیا کیا نہ اٹ درد دیے ــ جیسے پکتا رہے کوئی پھوڑا

میر کی منقسم شخصیت کے دونوں پہلوؤں میں تمام عمر کشمکش جاری رہی جس نے انھیں مردم بیزار، وحشی اور وہم آمیز بنا دیا۔ اس کشمکش کی تہ میں مجروح پدری نصب العین تھا۔ میر تقی میر اپنے باپ کے نقش قدم پر چلنا چاہتے تھے اور پدری نصب العین کو پالینے کے آرزومند تھے لیکن ان کی شوریدہ سری، آشفتہ طبعی اور ہوس ناکی انھیں غلط راہوں پر ڈال دیتی تھی جب پدری نصب العین ان کے پیش نظر ہوتا تو وہ جذبۂ صدق و صفا سے سرشار ہو جاتے۔ اسی عالم میں انھیں عشق کو جو ہر جو بعد میں ان کی اعلیٰ درجہ کی شاعری کا مقصد بن گیا تھا۔ ان کے ساتھ ہوا و ہوس اور کامجوئی نے کبھی انھیں چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ میر ذہنی کے الفاظ میں ڈاکٹر جیکل امن اور عشق کی زندگی بسر کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے اندر چھپا ہوا مسٹر ہائیڈ اسے پریشان کرتا رہتا تھا۔ اس کشمکش میں فتح بالآخر مسٹر ہائیڈ ہی کی ہوئی یہی المیہ میر تقی میر کا بھی ہے۔ ان کے ذہن و قلب میں پاک مشربی و ہوسناکی کے مابین کشمکش جاری رہی جس میں ہوسناکی حریف غالب ثابت ہوئی رہی لہٰذا میر تقی میر کا غایت بلند ان کے غایت پست کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔